© rasailojaraid.com

ادار یہ

اسلامی ریاست اور روح جمہوریت

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

اسلام کے نظامِ ریاست وحکومت کا محاکمہ کرتے ہوئے اکثر مغربی ناقدین اپنی جن ذہنی الجھنوں کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے زیادہ اہم اور بنیادی باتیں بظاہر صرف تین ہی ہیں۔ اولاً یہ خیال کہ اسلامی حکومت دراصل ایک تھیوکریسی ہے ثانیاً یہ تصور کہ اسلام اور جمہوریت متضاد اصطلاحات ہیں اور ثالثاً یہ مغالطہ کہ اسلامی نظام دراصل ایک متشدد بادشاہت یا آمریت کا نام ہے جس میں عوام کی رائے، مشورہ اور تائید کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان ذہنی الجھنوں کے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ علمی سطح پر جوابات اور تشریحات کی ذمہ داری دور حاضر کے معروف مسلم علماء وقتاً فوقتاً ادا کرتے رہے ہیں جن میں خصوصاً علامہ رشید رضا، علامہ اقبال، علامہ ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ محمد اسد سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان حضرات اور ان کے زیر اثر علمی افق پر ابھرنے والے جدید محققین مثلاً پروفیسر خورشید احمد نے اپنی متعدد تحریرات میں مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں سے ان مسائل پر گفتگو کی ہے لیکن بعض پہلو مزید بحث ونظر کے مستحق ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں ان تین ملاحظات پر اختصار کے ساتھ چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

معروف مغربی نقاد Bernard Lewis نے اپنے کئی مضامین اور کتب میں اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ

The Islamic state was in principle a theocracy... For believing Muslims, legitimate authority comes from God alone, and the ruler derives his power not from the people, nor yet from his ancestors, but from God and the holy law... Rulers made rules, but these mere considered, theoretically, as elaboration or interpretation of the valid law - that of God promulgated by revelation.*

* Bernard Lewis, "Islam and liboral Democery". *The Atlantic, February 1993*, p 4 (online version). (مضمون کا ترجمہ شامل اشاعت ہے)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گویا Bernard Lewis کے خیال میں خلافت راشدہ کے قیام میں عوام کی رائے کا کوئی دخل نہ تھا اور خلیفہ اپنی ہر تعبیر اور رائے کو الہامی درجہ دیتے ہوئے عوام پر زبردستی نافذ کر دیا کرتا تھا۔ اس تاریخی مغالطہ کے جائزے سے قبل مناسب ہوگا کہ اسلامی ریاست کے حوالے سے جو اصطلاح اوپر استعمال کی گئی ہے یعنی تھیوکریسی، پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لیا جائے۔

تھیوکریسی سے بالعموم وہ سیاسی اقتدار مراد لیا جاتا ہے جو ایک مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ عیسائیت میں کلیسا اور اس کے نمائندے کو روح مقدس (holy ghost) کے براہ راست وجدانی یا روحانی طور پر رابطہ کی بنا پر اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی زبان سے اس فیصلہ کا اظہار کر سکے جو اس روحانی عمل کے نتیجہ میں ذہن میں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تھیوکریسی کا یہ تصور عیسائیت کی ایجاد نہ تھا بلکہ تاریخی طور پر اس کے اصل موجد اور صدیوں اس پر عمل کرنے والے یہودیت کے علمبردار مذہبی رہنما تھے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار رائنڈ رسمتھ کے بقول Josephus نے پہلی مرتبہ یہ اصطلاح استعمال کی۔ جوزیفس کا سنہ پیدائش ۳۸ میلادی ہے اور اس کا تعلق اعلیٰ یہودی مذہبی پیشواؤں کے خاندان سے تھا۔ یہودی تاریخ میں اس اصطلاح کا اطلاق کسی بھی ایسے قبائلی یا ریاستی طرز حکومت پر کیا جاتا تھا جو خدائی قانون پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتا ہو۔ مصنف کے بقول "The idea of government by god was the dominant one in Israelite poilty" (E.R.E vol 12, p. 287).

اسرائیلی تاریخ اور سیاست میں Jahweh (یہودیت میں خالق کائنات کا اسم ذات جس کا صحیح تلفظ 'یح وَیح' ہے) کی حکومت ایک مستقل تصور کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ یہی مقالہ نگار آگے چل کر کہتا ہے:

For early Israel three things were indissoluble; Jahweh's shrine, Jahweh's book, Jahweh's priest, the three together formed the normal organ of theocracy (p 287).

اس تثلیث میں سب سے زیادہ مرکزی مقام ربائی کو حاصل تھا جس پر الوہی روح کا نزول ہوتا تھا۔ اس کے لیے معروف الفاظ یہ تھے:

"The spirit of the Lord came upon so and so" (p. 287)

یہی روایت آگے چل کر عیسائیت میں رواج پا گئی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

---Its perfect preacher was Jesus. He accepted the phrase, the Kingdom of God, and so looked for a theocracy, but He gave the phrase His own exposition and laid down the true method of the Kingdom's Coming. (p338) There can be a perfect theocracy only when any man acts only under the guidence of the Holy Spirit (p 289).

معروضی طور پر دوبارہ اس یہودی اصطلاح کی تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کے تین عناصر ترکیبی نظر آتے ہیں۔ اولاً خدائی عبادت خانہ (مثلاً حضرت سلیمان کا ہیکل) ثانیاً تح وتح کی کتاب (یعنی تورات) اور ثالثاً تح وتح کی ہدایت کا ترجمان ربائی۔ عبادت گاہ اپنے تقدس کے باوجود کسی معاملہ میں زبان حال سے اظہار کرنے سے قاصر ہے۔ کتاب لازمی طور پر ہدایت کا سرچشمہ قرار دی جا سکتی ہے لیکن اصل فیصلہ کن مقام اُس تعبیر کا ہوگا جو Spirt of the Lord کے ذریعہ ربائی سے ظاہر ہوگی۔ یہی Spirit of the Lord عیسائیت میں Holy Spirit کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور چرچ یا کلیسا اور اس کا نمائندہ پوپ علاماتی طور پر Holy Spirit کی ترجمانی کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح تھیوکریسی تشکیل پاتی ہے۔

اسلام کے حوالے سے غور کیا جائے تو پہلی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں ہیکل سلیمان یا عیسائیت کے سیاق میں چرچ سے مشابہ کوئی ادارہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی نظام میں وہی مرکزیت حاصل ہے جو قانون کو دیگر نظاموں میں حاصل ہوتی ہے، لیکن تیسری اکائی یعنی راہب، ربائی یا پادری اور پوپ کے مقابل کوئی مذہبی پیشوا حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ میں پائے جانے والے مجتہدین اور مابعد کے ادوار میں ائمہ مسالک و مذاہب غرض کسی فرد کو بھی یہ مقام حاصل نہیں رہا کہ وہ Holy Spirit کی قسم کی کسی ہستی سے براہ راست رابطہ کی بنا پر خود authenticity اختیار کر جائے۔ ہماری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اگر امام جعفر صادقؒ نے ایک رائے قائم کی تو امام ابوحنیفہؒ نے ان کے شاگرد ہونے کے باوجود ان سے اختلاف کیا اور یہی شکل ان کے تلامذہ امام حسن الشیبانی اور امام ابویوسف نے ان کے ساتھ ان کی زندگی اور بعد میں اختیار کی اور بعض متقدمین اور فقہاء نے اپنے سے قبل کے اکثر علماء وفقہاء کے اجتہادات وآراء کو پس پشت ڈالتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے نئے سرے سے اصول تعبیر وتفسیر کو اختیار کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی بناء پر جدید اجتہاد کی دعوت دی۔ امام ابن تیمیہ کا نام اس حوالے سے نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اوران تمام تعبیرات وتشریحات میں کسی ایک مجتہد یا امام نے بھی اپنی رائے کے لیے الوہی تقدس یا Divine sanction حاصل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، نہ انہیں بعد میں آنے والوں نے یہ مقام بخشا۔

حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ ربائیوں یا راہبوں کے تقدس کو تو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ''لا رہبانیہ فی الاسلام'' نے قیامت تک کے لیے مغربی اصطلاح میں de-sacrilize کر دیا تھا۔ اس لیے کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور امام کو وہ مقام عصمت حاصل نہ ہو سکا جو ایک انسان کی فکر، تعبیر یا تشریح کو immunity فراہم کر دے۔

اس حقیقت واقعہ کی روشنی میں ہمیں یہ دقت پیش آتی ہے کہ یہودی اور عیسائی تصور Theocracy کو کس طرح اسلام پر چسپاں کیا جائے؟ ہاں اگر اسلام کی تمام تاریخ، فقہی اور تفسیری ادب کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام میں بھی دینی عالم، فقیہ یا امام کا مقام وہی رہا ہے جو ماقبل کی مذہبی روایات میں تھا جب بھی یہ حقیقت کے برخلاف ایک قیاس اور مفروضہ ہی رہے گا۔ تاریخی حقیقت نہیں بن سکے گا۔ اسلام میں تھیوکریسی کو تلاش کرنا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک گھٹاٹوپ اندھیرے کمرے میں ایک ایسی سیاہ بلی کو تلاش کیا جائے جو کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔

جب یہ بات ایسے افراد فرماتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا اور ذریعہ معاش مسلمانوں اور اسلام پر ان کی تحقیقات ہوں تو مزید تشویش اور افسوس ہوتا ہے کہ کیا ان کی گوہر افشانی کا کوئی تعلق اس زمینی حقیقت سے بھی ہے جو قرآن وسنت اور امت مسلمہ کے پندرہ سو سال کے عمل میں محفوظ ہے۔

دوسری فکری مشکل جو مغربی اہل قلم کی تحریرات میں بار بار ابھرتی ہے یہ ہے کہ کیا اسلام اور مغربی سیکولر جمہوریت بلکہ محض جمہوریت دو متضاد تصورات ہیں۔ یہ ایک دلچسپ معاملہ ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ بہت سے مسلمان مفکرین بھی اس معاملہ میں ذہنی خلفشار کا اظہار کرتے ہیں۔ دور جدید کے صف اول کے مسلمان علماء علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے اسلام کی بنیادی سیاسی فکر کی وضاحت کرتے ہوئے لادینی جمہوریت کو جس میں قوت کا مطلق سرچشمہ عوام کو قرار دیا جاتا ہے، رد کرتے ہوئے اسلام کے نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشاورت کو روح جمہوریت کی اعلیٰ ترین شکل قرار دیا ہے اور سیاسی قوت میں شرکت کے عمل کو تاریخی اور نظری دونوں حیثیتوں سے عقلی تجزیہ کے ساتھ ایک جدید لہجہ میں پیش کیا ہے۔ اگر صرف ان دو مفکرین کا مطالعہ کر لیا جائے جن کی تحریرات اس موضوع پر انگریزی میں بھی موجود ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا تصور جمہوریت یا سیاسی حکمرانی کے اصول سات نکات پر مبنی ہیں۔ اس میں اولین نکتہ اور ترجیحی اعتبار سے سب سے اہم قرآن و سنت کی بالادستی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جو چیز اسلام کے نظام کو مغربی جمہوریت سے مشابہ کرتی ہے وہ فرد یا خاندان یا پارٹی کی جگہ قانون کی حکمرانی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں قانون سازی کا حق نہ سلطان کو تھا نہ بادشاہ یا خلیفہ کو حاصل رہا بلکہ قانون اور فقہ کی تشکیل ایک مستقل اور آزاد ادارہ نے کی جس کی سربراہی آزاد اور غیر سرکاری افراد نے معاشرتی قبولیت واحترام کی بنا پر کی اور ان کی مدون کی ہوئی قانونی اور فقہی آراء کو مختلف حکمرانوں نے نافذ کیا۔ یاد رہے ان علماء کا مقام کبھی وہ نہیں رہا جو یہودیت میں ربائی یا عیسائیت میں پادری کا تھا۔ ان کی آراء کی مقبولیت کی بنیاد کوئی روحانی قوت نہ تھی بلکہ محض اور محض عقل و نقل کی بنا پر دلیل اور برہان کی بنا پر اور حالات سے مطابقت کی بنا پر ان کی آراء کو مقامِ اہمیت ملا۔

اسلامی نظام سیاست و حکومت کی تیسری اہم خصوصیت سیاسی، معاشی، معاشرتی مسائل میں ہر سطح پر شوریٰ کے نظام کا پایا جانا ہے جس کے ذریعہ ایک ماہر اور ایک عام شخص مشاورت میں شرکت کے ذریعہ فیصلہ کا جزو بنتا رہا۔ گویا فیصلے اور قانون کسی الہامی ادارے نے اوپر سے نافذ نہیں کر دیے بلکہ ایک وسیع تر مشاورتی عمل نے فیصلوں کی توثیق یا تردید کی۔ اس کی نمایاں ترین شکل دور عباسی کا فتنہ خلق قرآن ہے جو حکمرانوں کی بے بسی اور وسیع تر شورائی عمل، حریت فکر اور آخر کار امت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کے غلبہ کو ظاہر کرتا ہے۔

چوتھی اہم خصوصیت اسلامی اصول حکمرانی کا مقاصد شریعہ کا تابع ہوتا ہے، یعنی جو بنیادی حقوق شریعت نے انسانوں کو دیے ہیں، سیاسی نظام اور قوت حاکمہ ان کی پابند ہے اور ان میں سے کسی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتی۔ اس میں انسانوں کی جان، عقل، دین، عزت و عصمت اور مال کے تحفظ کے ساتھ مکمل عدلِ اجتماعی کا قیام شامل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کے نظام سیاسی کی پانچویں خصوصیت عدلیہ کی آزادی ہے اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سخت سے سخت بادشاہت کے دور میں بھی عدلیہ نے اپنے وقار اور آزادی کو مجروح نہیں ہونے دیا اور اکثر وقت کے فرمانروا کو عدلیہ کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔

چھٹی اہم خصوصیت سیاسی نظام میں افراد کی اجتماعی فلاح کے لیے ایسے ادارے کا وجود ہے جس کا سیاسی استعمال نہیں کیا جا سکتا یعنی زکوٰۃ جو معاشرہ کے ضرورت مند افراد کو بغیر ان کے حقوق کا استحصال کیے معاشرہ میں معاشی استحکام اور خود انحصاری دینے کا ایک قانونی، الہامی، اور معاشرتی ادارہ ہے۔ ان اصولوں کے نتیجہ میں ساتویں صفت خود ابھر کر سامنے آتی ہے یعنی سیاسی معاملات میں اختلاف رائے۔ اجتماعی طور پر ایک رائے پر مجتمع ہونا اور بلا کسی خوف یا دباؤ کے اپنی رائے کو پیش کرنا اور ضرورت پڑنے پر احتجاج کرنا۔

ان اصولوں کی موجودگی اور عملی طور پر پندرہ صدیوں کا عمل ایک متلاشی حق اور حقیقت بین نگاہ پر اسلام کی روح جمہوریت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہاں جو جان بوجھ کر ایک روشن اور تابناک سورج کا انکار کرنے پر آمادہ ہو اسے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کسی معجزہ سے ہدایت دے سکتے ہیں۔

اسلام اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ کرتے وقت یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مسلم دنیا میں بادشاہتیں اور فوجی آمریتیں پائی جاتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اسلام اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر معروضیت کو بنیاد بنا کر مسلم دنیا کا جائزہ لیا جائے تو خود بعض مغربی اہل قلم سیاسی حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات کہنے پر آمادہ نظر آتے ہیں کہ ان نام نہاد حکمرانوں کے وجود اور استحکام کی بنیاد اگر کوئی ہے تو صرف وہ ممالک اور ان کے سربراہان جو دن رات جمہوریت کے تقدس کی قسمیں کھاتے ہیں اور خود کو اعلیٰ ترین جمہوری اقدار کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔ ان میں سرفہرست برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ رابن رائٹ جو *Los Angeles Time* کی نامہ نگار ہے، اپنے ایک مضمون میں (جس کے لیے اسے ایک امریکی ادارہ کی طرف سے تحقیقی امداد دی گئی تھی) اس بات کا اظہار کرتی ہے:

If Algeria is any example, however there is an implicit exception: Any counrty where Islam is the winner of a democratic election.The lack of U.S response, at a time when the Bush adminsitration is active and outspoken in adovacating political pluralism, makes it

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

apear that the White House prefers a police state to an Islamic democracy *

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف الجزائر بلکہ ترکی میں جب اسلام دوست وزیراعظم جمہوری ذریعہ سے برسر اقتدار آیا تو اس جمہوری روایت کا قتل ان ہی افراد کے ہاتھ سے ہوا جو ہر لحہ جمہوریت کی تسبیح پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ افراد اور ممالک ہیں جو عرب دنیا میں بادشاہوں اور فوجی آمروں کی حمایت کرنے میں سب سے آگے رہے ہیں۔ یہی ممالک پاکستان میں اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے فوجی حکمرانوں کی مستقل حمایت کرتے رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام مسلم ممالک میں فوجی آمروں اور بادشاہوں کو حمایت فراہم کرتا ہے یا وہ بیرونی ممالک جو نام نہاد جمہوریت کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ الجزائر، ترکی۔ دو واضح تاریخی اور عصری مثالیں ہیں جن کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں عوام الناس کی حقیقی رائے کو مکمل طور پر پامال کرتے ہوئے اسلام دشمن طاقتوں نے جمہوریت کے مقابلے میں فوجی آمریت کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ یہ حقائق ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اپنی تردامنی اور چاک قبا کو نظرانداز کرتے ہوئے جمہوریت کی پاکئ داماں کی حکایت پر اصرار کہاں تک اخلاقی اور عقلی رویہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسلم دنیا میں برپا تحریکات اسلامی نے بالعموم اپنے لیے ایک دستوری جمہوری راستہ منتخب کیا ہے اور گزشتہ نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ پاکستان ہو یا ملائشیا، ترکی ہو یا انڈونیشیا، اردن ہو یا الجزائر، سوڈان ہو یا تیونس، سخت ترین آزمائشی حالات میں بھی تحریکات اسلامی نے جمہوری اور دستوری ذرائع کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ یہ تحریکات جمہوریت دشمن ہیں اور اس بنا پر ان سے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو سخت خطرہ ہے، معروضیت کے دعوں کے ساتھ ایک مذاق ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں جس مکالمے کا حوالہ بعض مغربی اہل علم دیتے رہتے ہیں اس کا عملی آغاز رابن رائٹ کی طرح کھلا ذہن رکھنے والے افراد کو، ان کی بعض آراء سے اختلاف کے باوجود، مزید دعوت فکر

---

* Wright, R., "Islam, Democracy and the West", *Foreign Affairs*, Summer 92, Vol. 71 Issue 3, p. 131-146, (مضمون کا ترجمہ شامل اشاعت ہے)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دے کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف ایک شرط کے ساتھ کہ اسلام کی نمائندگی کرنے والے حضرات معذرتوں اور جارحیت دونوں سے بچتے ہوئے اسلامی تاریخی روایات اور قرآن وسنت پر مبنی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہوئے اس مکالمے میں برابر کے شریک ہوں اور محض ناظرین اور سامعین کا کردار ادا نہ کریں۔

عالمی طور پر مستقبل کا سیاسی نقشہ اسی وقت مستحکم ہو سکتا ہے جب انسانی حقوق کے دعوؤں کے ساتھ ان پر تھوڑا بہت عمل بھی کر لیا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کو لاتعلقی اور دشمنی کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ تعصب مذہبی ہو، سیاسی ہو یا ثقافتی انسان کی عقل کو فیصلہ کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے اور انسان ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو کسی بھی اخلاقی پیمانہ سے درست قرار نہیں دیے جا سکتے۔ افغانستان پر امریکی جارحیت اور یورپ کی بعض اقوام کی طرف سے اس ظلم کی حمایت یا اس پر خاموشی، فلسطین اور کشمیر میں حقوق انسانی کی پامالی پر نہ صرف خاموشی بلکہ ظلم اور انسان کشی کی حمایت اور اسلامی جمہوری تحریکات کے خلاف آمرانہ قوتوں کی پشت پناہی، گویا ہر سیاہ عمل ایسے افراد کو نیکی کا ایک باب نظر آتا ہے۔

مغرب اور اسلام کا بے لاگ اور غیر متعصب مکالمہ ہی مستقبل کے سیاسی استحکام کے امکانات کو روشن بنا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حوالہ سے تمام stake holders اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مکالمہ اور تفہیمی ذرائع کے استعمال میں تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

اسلام اور جمہوریت پر یہ خصوصی شمارہ گو ایسے موقع پر طبع ہو رہا ہے جب وطن عزیز میں فرد واحد کی تجویز کردہ دستوری تبدیلیوں کے زیر سایہ ملک گیر انتخابات کے ذریعہ فوج کو دستوری تحفظات کے ساتھ سیاسی معاملات میں فیصلہ کن مقام دلانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اس موقع پر بعض ایسے بنیادی سوالات (مثلاً پاکستان میں سیکولر نظام وغیرہ) دوبارہ اٹھائے جا رہے ہیں جن کا تصفیہ پاکستانی قوم اس ملک کے قیام سے قبل اور بعد میں بارہا کر چکی ہے اور جسے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے پُرعزم اور دوٹوک انداز میں واضح کر دیا تھا۔ قائداعظم اور قوم کی جدوجہد اگر اسی لیے تھی کہ برطانوی سیکولر نظام سے نکل کر مغربی سیکولر نظام کو نافذ کر دیا جائے تو اس سے بڑھ کر سادہ لوحی ہمارے خیال میں ممکن نہیں۔ پاکستان کے حوالے سے سیکولرزم کی بات کرنا دستور پاکستان اور قوم کے متفقہ فیصلہ کا مذاق اڑانے بلکہ

© rasailojaraid.com